ڈاکٹر صوبیہ سلیم
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو،
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جیلانی بانو کے نسوانی کردار
(ایوانِ غزل کے تناظر میں)

The advent of British in the subcontinent paved path for a new era. Different novelists in Urdu literature have expressed this perspective in different expressions. Jillani Bano's novel "Awan-e-Ghazal" also shows depiction of the same thoughts. Jillani Bano is often known to be a writer who advocates women. In her works, the fair sex is often an innocent creature who is victimized by a man's tyranny, one way or another. In this vein Awan-e-Ghazal is not only a metaphor for an entire civilization but it also sheds light on the changes which occur in the lives of future generations.

انگریزوں کی آمد نے برصغیر میں تہلکہ برپا کر دیا۔اس بیرونی آمد کے ایسے اثرات اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے گئے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک جما جمایا نظام خلفشار کا شکار ہونے لگا۔جاگیرداری نظام، نوابوں کی زندگی، وظیفہ خواروں کے حالات دیکھتے ہی دیکھتے بدل گئے اور یوں جہاں اور بہت سے موضوعات ناول کا حصہ بنے وہیں حیدر آباد، اور لکھنؤ کے زوال کے سرے اسی انگریز آمد سے ملائے گئے۔ناول نگاروں میں عزیز احمد، قرۃ العین، جیلانی بانو اور احسن فاروقی کے ہاں ہمیں ایسے موضوعات ملتے ہیں۔ان سبھی کے ہاں کسی نہ کسی تناظر میں ان بنتے بگڑتے نقوش کا بیان ملتا ہے جنہوں نے اس علاقے کے لوگوں کی زندگی کو متاثر کیا۔جیلانی بانو کا ناول 'ایوان غزل' بھی ایسے ہی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔جہاں 'ایوانِ غزل' محض ایک عمارت نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔یہاں کے لوگ، ان کی زبان، ان کے بدلتے حالات، نوابی شان و شوکت کی ریتلی چوٹیوں پر کھڑے ان لوگوں کے پیروں تلے سے ریت کھسکنے لگی تھی۔ 'ایوانِ غزل' نئے حالات کے سامنے اس تہذیب کے دم توڑنے کا حال ہی نہیں سناتا بلکہ ایوانِ غزل میں بسنے والوں کی اگلی نسلوں کے بدلتے حالات اور ان کی زندگیوں کے نئے شب و روز کو بھی نہایت خوبی سے بیان کرتا ہے۔انگریز کے لائے ہوئے نظام نے جہاں حکومتی سطح پر تبدیلی پیدا کی، وہیں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر تبدیلی کا سب سے بڑا سبب انگریزی تعلیم تھی جس نے اعلیٰ طبقے میں آزاد روش پیدا کی۔ایک طرف نوابی نظام کی بے اعتدالیاں ہیں تو دوسری طرف نئی نسل کی بے پروائی اور بڑھی ہوئی بغاوت جو اپنے اصل سے ہے، قدیم و جدید کے نظریاتی اور عملی فرق کی تفسیر واحد حسین

زندگی کے گزرتے برسوں اور اس کی آنے والی نسلوں کے بدلتے حالات، ان کی زندگیوں اور شب روز میں دیکھی جا سکتی ہے۔ایوانِ غزل اس موضوع کے تناظر میں ایک وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ناول ہے۔جو تہذیب کے زوال کے پہلے اور بعد کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔اسی وسعتِ مضمون کا کریڈٹ دیتے ہوئے ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

ایوانِ غزل کا کینوس۔۔۔اس لحاظ سے وسیع تر ہے کہ واحد حسین کے دولت کدے 'ایوانِ غزل' کو حیدر آباد کی تہذیب کی علامت کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔واضح رہے کہ علامت انتہائی گہرائی اور گیرائی سے متصف تکنیک سے بھی برتی جا سکتی ہے۔۔۔اس لیے ایوانِ غزل کے وسیع علامتی منظر نامے کے زیریں رو کے طور پر خاصے اہم تاریخی واقعات اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔(۱)

جیلانی بانو ایک نسائی لکھاری کے طور جانی جاتی ہیں۔ان کے ہاں عورتوں کے کردار مظلوم اور استحصال کا شکار نظر آتے ہیں۔ان کے نسوانی کردار جس بھی عتاب و عذاب کا شکار ہوتے ہیں اس کا سرا کہیں نہ کہیں مرد کے ظلم و ستم سے جڑتا محسوس ہوتا ہے۔

وہ اپنی کہانیوں میں 'سیتا' کو لکشمن ریکھا پار جانے کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتی۔اس لیے بقول ان کے سیتا کے ارد گرد سلامتی کے حصار باندھنا میرا مشغلہ ہو گیا اسی کو میری کہانیوں کی بنیاد کہہ لیجیے۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ ایوانِ غزل کے نسوانی کرداروں میں بھی ایک طرح کی مظلومیت اور استحصال کی کیفیت ملتی ہے۔یہ نسوانی کردار بدنام و رسوائے زمانہ ہیں مگر جیلانی بانو اپنے خاص رنگ میں ان کی بدنامی سے پردہ اٹھا کر اُس مرد کا چہرہ دکھاتی ہیں جو ان کے چہرے کی کالک کا سبب ہے۔حیدر آباد کی تہذیب میں پلنے والے نوابوں کے محلّوں کے اندر عورتوں کی زندگی کے رخ کو وہ ایک مختلف زاویے سے پیش کرتی ہیں جہاں وہ اپنے تمام تر روایتی پن کے باوجود مظلوم اور دکھیاری ہی لگتی ہیں۔ایوانِ غزل کے کرداروں میں نسوانی کرداروں میں تمام کردار کسی نہ کسی سے جاندار محسوس ہوتے ہیں مگر چاند اور غزل دو ایسے کردار ہیں جنہیں کلیدی قرار دیا جا سکتا ہے۔'چاند' واحد حسین کی نواسی ہے۔جس کا باپ نئی تہذیب کے نئے تقاضوں کو دل وجان سے قبول کر چکا ہے۔ہر نئی لہر کے ساتھ بہنے والے باپ نے چاند کو مغربی تعلیم و تہذیب سے آراستہ کیا اور یوں ان کے لیے ماضی کی اقدار و شان و شوکت اپنے معنی کھو بیٹھی اور انہوں نے خود کو نئے رنگ میں رنگ لیا۔چاند کا لباس، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی اس ماحول کی عطا تھی جس میں اس کے باپ نے اپنی جگہ بنانے کے لیے اپنے ماضی سے پیچھا چھڑا کر اپنا راستہ بنایا تھا۔وہ ولایت پلٹ تھا اس لیے مغرب سے متاثر ہونا فطری تھا۔لہذا بیٹی کو ایک خود مختار عورت کے روپ میں دیکھنے کی خواہش میں وہ بھول گئے کہ انگریزی تہذیب عیوب سے پاک نہیں اور اس کے ثمرات انہیں بہرحال بھگتنے پڑیں گے۔یہی وجہ ہے کہ اپنے ماحول میں رچ بس جانے اور تعلیم اور آزاد ماحول کی آگاہی نے چاند کو بغاوت کی راہ دکھا دی۔یہ خود سری بچپن میں من مانی اور دھونس کی صورت میں ظاہر ہوئی۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی سوچ، اپنے خیالات بننے لگے۔اس نے اپنی چاہنے والی ماں کا صدمہ برداشت

کیا، باپ کی سامراج دشمنی کے خیالات اور اس پر ہونے والی بحثیں اس سے ہضم نہ ہوتیں۔وہ خود اونچی سوسائٹی کا ایک روشن چراغ بن کر چمک رہی تھی دوسری طرف باپ عملی طور پر سوشلسٹ کمیونٹی کا رکن بن رہا تھا۔ان دونوں میں نظریاتی اختلافات کے باعث کھٹ پٹ رہنے لگی اور جب اس کے باپ نے تعلیم یافتہ کمیونسٹ عورت سے شادی کا سوچا تو وہ خود کو اس گھر میں کہیں بھی فٹ نہ کر پائی اور ایوانِ غزل کی بانہیں اس کے لیے وا ہو گئیں۔وہاں وہ اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود چاہی جاتی تھی۔اس نے اپنی روش نہ بدلی۔مخلوط محفلوں میں شرکت اور مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے باعث اس کے لیے بہت سی باتیں معیوب نہ تھیں مگر چودہ برس میں کیے جانے والے رومانس نے اسے سمجھا دیا کہ اس کے گھر پر جو روشن خیالی کا چراغ جل رہا ہے۔قدیم روایات کا تیل ابھی تک اس میں جل رہا ہے۔راشد ماموں اور رضیہ ممانی کی لاڈلی اور ڈیڈی کے ساتھ الجھنے والی کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔تو نہایت رومانوی انداز کی موت کے پیشِ نظر اس نے موت کو گلے لگانے کی کوشش کی تاکہ اس کا نام بھی محبت کے شہیدوں میں ہو۔دراصل اس نے آسودہ حالی اور عیش و عشرت کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔اس لیے کتابی دنیا رومانوی لگتی، وہ زیادہ جھمیلوں میں نہ پڑتی تھی۔بچپن سے ہی اچانک اس کا کسی کھیل کے درمیان میں دل اُوب جاتا تو وہ سب کچھ بھول کر اُٹھ کھڑی ہوتی اسے کسی کام کے تکمیل پاجانے سے سروکار نہ ہوتی۔یہی خوبی اس کے کام آئی اور ناکام عشق کے زہر نے اُس کو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹا دیا۔ میڈیکل کالج کی آزاد فضا نے اُس کو پھر سے لاپروا اور ہر دل لعزیز بنا دیا۔اس کی عادات اور مزاج کی خرابی پر تنقید کے باوجود کسی نے اُس کو سدھارنے کا نہ سوچا۔ان عادات اور سوچ کے فرق نے اس کے ذہن کا خرابہ کیوں کر کیا۔کسی نے نہ جانا۔ہاں البتہ اس کے ماموں راشد نے اس کو اپنی ترقی کا وسیلہ جان کر خوب خوب اس کی حمایتیں کیں اور چاند کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ ماموں کے ہاتھوں بڑے بڑے سودوں میں استعمال ہو رہی ہے۔اس کی شہرت اور سوسائٹی میں مقبولیت کو راشد نے خوب کیش کیا۔'ایوانِ غزل' کے ڈگمگاتے وقار کو سہارا دینے میں راشد کے موقع پرست ہونے کا جتنا ہاتھ تھا اُتنا ہی چاند کے حسن کا کمال بھی۔جس کو سیڑھی بنا کر راشد کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور چاند ایک مکمل سوسائٹی گرل بن گئی اس کے طور اطوار ،ایوا ن غزل کی کسی عورت سے بھی نہ ملتے تھے کہ ایسی آزادی ان درودیوار نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ واحد حسین کے لیے یہ حقیقت جان لیوا تھی کہ 'ان کی نواسی لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری پڑھ رہی تھی، بے پردہ گھومتی، اسٹیج پر میک اپ کر کے ڈراموں میں کام کرتی تھی اور گانے گاتی تھی۔[۳]

یوں تو چاند نے اپنے ماموں ممانی کی رہنمائی میں خود کو سنوار کر سوسائٹی میں پیش کیا اور یوں ان کی نہ صرف زندگی سنوری بلکہ ان کے رہن سہن اور رنگ ڈھنگ میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی مگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہی راشد کے خیالات میں تبدیلی آنے لگی۔رضیہ ممانی پر اس کے کردار کے عیوب واضح ہونے لگے اور وہ ان خامیوں پر نکتہ چینی کرنے لگیں جس سے ان کی اپنی بیٹی کے خراب ہونے کا خدشہ تھا۔غرض چاند ایک ایسی لڑکی کے طور پر سامنے آتی ہے جو خوش لباس، تعلیم یافتہ اور نئے خیالات اور حالات سے خود کو ہمکنار کر چکی ہے۔جب کہ اس کے نانا جو سلطنتِ آصفیہ

کے عروج کے خواب دیکھتے ہیں اور جہاں کی بوڑھی عورتیں ابھی تک قدیم روایات سے بندھی ہوئی ہیں۔ان سب لوگوں میں وہ تمام تر محبت کے باوجود ایک مثالی لڑکی نہیں اور رضیہ ممانی اس کو اپنے شوہر کے ہاتھوں سوسائٹی گرل بنتے تو دیکھ سکتی تھیں مگر اپنی بیٹی فوزیہ کے لیے ان راہوں کو ممنوع قرار دیتیں۔ایسے میں چاند ایوانِ غزل میں بھی مس فٹ ہو جاتی ہے اور یوں اس کی تنہائی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جس کو دور کرنے کے لیے وہ ہمیشہ باہر کی محفلوں میں اپنا دل الجھاتی ہے اور یوں کبھی اس کا نام کسی ڈاکٹر کے ساتھ سننے میں آتا تو کبھی کسی ڈرامہ کمپنی کی رنگینیوں میں۔چاند کا دل ٹھہرتا ہے تو سینچوا پر جو باغیوں کا ساتھی ہے۔اس کے باپ کی طرح کمیونسٹ جس کے پاس اس کے حسن کو سراہنے سے اہم کام مزدوروں کو بچانا ہے جو خود کو چاند کی محبت سے بچاتا، اس کو نظر انداز کرتا ہے۔چاند اس کو اپنا آپ سجا کر پیش کرتی مگر وہ ایک نگاہ ڈال کر چل دیتا۔اسی نظر اندازی نے غزل کے دل کو چوٹ پہنچائی اور چاند کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔پس اس محبت کی چوٹ کے بعد چاند کا دل دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔یہ بے نیازی راشد ماموں سے ہضم نہیں ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک بھان صاحب اور اندر لال سے تعلقات سماجی اور مالی ترقی میں گامزن ہو سکتے تھے جب کہ سنجیوا جیسے کمیونسٹ ہندو کے لیے جس کے پیچھے حکومت کے ہرکارے ہر وقت دوڑے رہتے تھے سے تعلق رکھنا نہ صرف بے فائدہ تھا بلکہ ایوانِ غزل کو بھی حکومت کی نظر میں گرا سکتا تھا۔چاند دن رات کے اُس کھیل سے اُکتا جاتی ہے اور سنجیوا کی محبت کا جوگ لے کر گھر بھر سے عداوت مول لیتی ہے اور ہر ایک کی لعن طعن کا سبب بننے لگتی ہے۔وقت کچھ یوں چولا بدل لیتا ہے۔

ان کے نام پر نانا صفت کے منہ میں کوئی کڑوی کسیلی سی چیز آ جاتی تھی جسے وہ کھنکار کے تھوک دیتے تھے۔ راشد ماموں ان کے کمرے کی طرف کبھی نہ دیکھتے تھے۔بی بی چاند کے نام پر ٹھنڈی سانس بھر کر یوں سر پر پلو سنبھالتیں جیسے اپنی مرحوم بیٹیوں کے ذکر پر کرتیں۔رضیہ جان بوجھ کر چاند سے بات نہ کرتی۔ صرف لنگڑی پھپھو تھیں جو لاٹھی کے بل پر ان کے کمرے میں گھسٹتی ہوئی جاتیں تو ساری زندگی کے دل میں دبائے ہوئے طنز اور گالیاں الٹ دیتی تھیں۔ لنگڑی پھپھو کی اتنی سی بکواس کے جواب میں چاند آپا کی وہ تیز حاضر جواب زبان ذرا بھی نہ ہلتی۔وہ منہ چھپا کر۔۔۔سسکیاں لیتی تھیں۔(۴)

چاند تمام دنیا سے بے نیاز بہت دن تک سنجیوا کی بے نیازی کا دکھ اور گھر والوں کے رویے کا ماتم مناتی رہی اور آخر گھر چھوڑ کر چل دی۔ سنجیوا کے ساتھ نے سنجیوا کے ارادے کو تو متزلزل نہ کیا مگر جب غزل گھر واپس آئی تو محبت کا یہ روگ ٹی بی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔یہ چاند تھی جس نے نو عمری کے عشق میں زہر کھایااور پھر دنیا کی طرف لوٹ گئی مگر ہوشمندی کے اس تعلق کو وہ فراموش نہ کر پائی۔حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اُسے احساس ہونے لگا کہ وہ کس طرح آسمان پر ستارہ بن کر چمکائی گئی اور خود مختاری کی پہلی ہی کوشش پر اس کو زمین پر دے مارا گیا۔چاند دراصل ایسی لڑکی ہے جو محبت اور آسودہ زندگی گزارتی رہی اور اپنے ماحول میں خود کو رچا بسا دیکھنے کی اس کے باپ کو بھی خواہش تھی

اور ماموں کو بھی۔لہذا وہ اپنی زندگی کو دوسروں کی رضا مندی سے ہنکاتی رہی۔یہ ادراک اُسے یقینا ہوتا ہو گا کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔اپنے ماموں کے لیے فائدہ مند چیز کی طرح اہم، مگر اُس نے کبھی بھی خود کو اس ماحول یا اس کاروبار سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اور یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ اس حال میں خوش اور مگن تھی اس کی صحت پر فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کس کو فائدہ پہنچا رہی ہے مگر اس کے لیے سب سے بڑا غم یہ تھا کہ اُس کو زندگی میں اپنی راہ منتخب کرنے کا حق نہ دیا گیا۔اپنے تمام تر باغی پن کے باوجود وہ جلد گھٹنے ٹیک کر خود کو غم کی لہروں کے حوالے کر دینے والی ایک کمزور عورت بن جاتی جو اپنے حق کے لیے لڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔اس لیے وہ نہ تو راشد کی مرضی کے خلاف چل سکی اور نہ ہی سنجیوا کے دل میں اپنا پیار بسا سکی۔بظاہر چاند کی تباہی ان مردوں کا شاخسانہ محسوس ہوتی ہے جنھوں نے اُس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا مگر درحقیقت اس کی مظلومیت صرف وہیں محسوس ہوتی ہے جب وہ اپنی مرضی سے شادی جیسے فیصلے پر لوگوں کی مخالفت مول لینے کے باوجود اپنے محبوب کو اپنا نہیں بنا سکی۔گویا وہ ہر شخص کے کام آنے کو تیار تھی بس اس کے عوض اس نے انتخاب کا حق مانگا مگر وہ خالی دامن ہی رہی، اسی لیے وہ غزل سے کہتی ہے:

میں تو صرف چھبیس برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں لیکن غزل تو بھی خود چلنا چھوڑ دے اپنی تقدیر خود بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔اس لیے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھما دے ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا تجھ سے اپنی کامیابیوں کے قُفل کھولیں گے اور تجھے پھینک دیں گے۔(۵)

چاند ایک دیو داسی بن کر سنجیوا سے ایک آفاقی سا رشتہ قائم کرنے میں خود اپنی جان کو رولتی ہے۔اس کے دکھ کو نہ صرف سر پر سوار کر کے ٹی بی جیسے مرض کو گلے لگاتی ہے بلکہ سنجیوا اور قیصر کے رشتے کی نشانی 'کرانتی' کو بھی اپنانے پر تیار ہو جاتی ہے۔کیونکہ کرانتی کو لانے والی قیصر اُسے پیغام دیتی ہے کہ سنجیوا کو یقین ہے کہ کرانتی کو صرف وہی بچا سکتی ہے۔یہ مان اتنا بڑا ہے کہ چاند کی ساری تکلیفیں اور سارے درددور ہو جاتے ہیں گویا اُس کے ہاتھ اپنی محبت کا سرا آ جاتا ہے۔زندگی کے طویل برسوں میں شانتی کی یہ پھوار وہ سہہ نہیں پاتی اور مر جاتی ہے اور یوں وہ اپنی زندگی کامقصد پا لیتی ہے اور گھر والےاس بے فائدہ چیز سے نجات حاصل کر کے دوبارہ اپنی زندگیوں میں لوٹ جاتے ہیں۔

اس ناول کا دوسرا کلیدی کردار 'غزل' ہے۔'غزل' واحد حسین کی نواسی ہے۔بتول جیسی صابر ماں اور ہمایوں جیسے ہڈ حرام مردوں کی اولاد جو مرشدوں کے ہاں نحوست کا پیغام لائی۔کہ ان کی بیٹی کو کوئی بیاہتا نہیں اس پر کجا یہ کہ ہمایوں کی ماں شوہر کی تو لاڈلی تھی مگر مسکین علی شاہ کی دوسری بیویوں نے نہ تو اُس کی ماں کو نکاحی بیوی تسلیم کیا اور نہ ہی ہمایوں کو اس کی جائز اولاد۔نتیجتاً ہمایوں جو اپنے بیٹوں کے بل بوتے پر یہ سوچے بیٹھا تھا کہ ان کے لیے دادا کی بھیک کا ٹھیکرا رحمت علی شاہ کے مقبرے کی کوئی اینٹ نہ چھوڑے گا۔سوتیلے بھائیوں کے ہاتھوں اپنے باپ کی جائز اولاد نہ ٹھہرایا گیا اور اُسے جائیداد سے قطعی طور پر دستبردار ہونا پڑا۔بیٹی کی غیر متوقع آمد اور سوتیلے بھائیوں کے باعث اس کی قسمت نے جو پلٹا کھایا تو اُس کے لیے وہ غزل کے سوا کسی اور کو قصور وار نہ قرار دے پایا کہ غزل کی دنیا میں آمد اس کے لیے نہایت

منحوس قرار پائی تھی۔اس لیے غزل نے بچپن سے ہی ایک ازلی بیر باپ کے دل میں دیکھا جس کے لیے اس کا معصوم دل کوئی جواز نہ تلاش کر سکا۔ بچپن سے ہی عدم توجہی کا یہ شکار گھر بھر کی ناپسندیدہ ہستی تھی۔ ننھیال میں اُس کا موازنہ فوزیہ سے کیا جاتا جب کہ فرشتوں کی مانند مہربان اور پریوں جیسی خوبصورت چاند باجی اس کے مدِ مقابل ہوتیں۔ایسے میں وہ سارا وقت یا تو چاند کی طرح بننے اور اس کے قرب میں وقت گزارنے کو زندگی کی معراج جانتی یا پھر فوزیہ کے لاڈ کو دیکھ کر ویسے ہی لاڈ اٹھوانے کی کوشش میں مزید سبکی اور مار سے نوازی جاتی۔اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ فوزیہ کی ضد پر ماموں ممانی اُس کے نخرے اٹھاتے، اُس کی منت کرتے اور وہی حرکت کرنے پر اُسے ماں باپ کی جوتیاں اور لاتیں کھانی پڑتیں۔ ننھیال میں اُس کی ماں پیسے بٹورنے کے مشن پر بھیجی جاتی اس لیے ان سب کی کوئی عزت نہ تھی۔غربت اور گندگی کے باعث غزل میں اچھے اوصاف اور اعلیٰ کردار یا تعلیم کے حوالے سے نہ تو کوئی رہنمائی تھی اور نہ ہی اس کے گھر میں اس بات کی اہمیت تھی کہ وہ کیسی ہے اور اُسے کیسا ہونا چاہیے۔باپ کی نفرت اور ماں کے سارے دکھوں کا مداوا یہ تھا کہ وہ پٹتی رہی۔فوزیہ کی اترن اس کا لباس تھی ایسے حالات میں اس کی شخصیت کا بکھرنا قطعی فطری تھا۔عام طور پر جن بچوں کو تنقید کا سامنا ہوتا ہے وہ اپنے لیے وہی معیار مقرر کر لیتے ہیں جس کی اُن پر چھاپ ہوتی ہے اور وہ خوب دل بھر کر وہ تمام حرکتیں کرتی ہیں جن سے انہیں سکون اور تمام دنیا کو کراہت اور بے سکونی ملتی ہے۔غزل کا رویہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ ممانی کے بچوں کو ہر وہ حرکت سکھاتی جو اس کے حساب سے بہت اچھی اور صحیح تھی اور یوں وہ شاہین اور فوزیہ کو اپنے رنگ میں رنگنے کی خوب کوشش کرتی مگر نتیجتاً اور بھی بری اور ماں کی مار کی مقدار قرار پاتی۔دوسروں کو تو شاید وہ معاف کر دیتی مگر جب اُس کی ماں نے اُس کو کبھی پیار نہ کیا تو وہ اس محرومی کو نہ سمجھ پائی اور نہ سہہ پائی۔کسی دوسرے کے بچے کو جب وہ محبت حاصل ہوتی جو اس کے نصیب میں نہ تھی تو جسمانی بھوک سے زیادہ یہ محبت کی بھوک اس کے وجود میں ہلچل مچا دیتی مگر اس کے باوجود جب اس کی ماں مر گئی تو اُسے اپنی تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہونے لگا۔اُسے ان پوریوں کا مزہ بھی نہ بھایا جو شاید عام دنوں میں وہ ناک تک ٹھونس لیتی۔وہ اتنی کم عمر تھی کہ اس خالی پن کا احساس تو کر سکتی تھی مگر اُس کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ماں کی موت کے بعد باپ کا رویہ درشت ہوتا گیا اور غزل کے دل میں محبت کی آگ اور بھی بڑھتی گئی اس کا دل چاہتا دھونس جمانے کے بجائے اُس کو کوئی پیار سے کچھ کہے تو اس کے لیے جان بھی وار دے۔باپ اُس کو مارتا تو وہ سوچتی کہ شاید دن کے کسی پہر اُسے خیال آئے گا کہ وہ اس کو اپنے پاس بلا کر لپٹائے گا۔مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔

ابا دن بھر اُسے مارتے پیٹتے اور دن بھر وہ منتظر رہتی کہ اب کی بار مارنے کے بعد ابا اُسے کلیجے سے لگائیں گے اور ان کی گود میں منہ چھپا کر وہ رو پڑے گی۔دن رات رونے کے باوجود اس کی آنکھیں ان آنسوؤں کو سنبھالے سنبھالے بوجھل ہو گئی تھیں جو کسی کے ہمدردی کے بولوں پر ہی بہائے جا سکتے تھے۔ویسے تو اماں کو بھی ہزار مکروں نے کبھی اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ وہ رضیہ کی طرح اپنی بیٹی کے گالوں پر پیار کریں۔مگر کبھی کبھار ابا کی مار کھانے کے بعد وہ غزل

کو سینے سے لگا کر روتی تھیں تو غزل کو بڑا اچھا لگتا۔۔۔جی چاہتا اماں یوں ہی روتی رہیں اور وہ ان کے سینے سے لگے لگے سوتی رہے۔لیکن اب تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں رہا تھا۔(۶)

بچپن کی محرومی، غربت اور نفرت کے دشت میں اگر کوئی نخلستان تھا تو وہ چاند کی ذات تھی جسے وہ اپنا آئیڈیل سمجھتی۔کیونکہ وہ ہمیشہ اس سے محبت بھرا سلوک کرتی۔

چاند ایوانِ غزل کی واحد فرد تھی جو آج تک غزل کی کسی حرکت پر نہیں ہنستی تھی۔ نہ اُسے ڈانٹا اور نہ اپنے کمرے سے نکلنے کا حکم دیا۔چاند غزل کی آئیڈیل تھی۔(۷)

وہ نہ صرف چاند سے اُس کے رویے کی وجہ سے متاثر تھی بلکہ وہ ان رویوں کی بھی مشتاق تھی جو محض چاند سے ہی روا رکھے جاتے۔جہاں وہ راشد ماموں کے ساتھ قدم ملا کر تقریبات میں جاتی تو رضیہ ممانی اس کے ناز نخرے اٹھاتیں۔ہر مرد اس کے قدموں میں دل نچھاور کرنے کو تیاررہتا۔شہر بھر میں ان کے چاہنے والے تھے۔کوئی ان کے حسن کا دیوانہ تو کوئی ان کے فن کا قدر دان۔ایسے میں محبت کی ترستی ہوئی غزل کے لیے چاند جیسا بننے کی خواہش کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔اس لیے چاند سے متاثر ہوتے اور اسی تقلید کے باعث اس نے چاند کے کہنے پر اسٹیج پر کام کیا تو اس کو خوب خوب اہمیت ملی۔اسٹیج اور سوسائٹی کے دفتر میں اس کی خوب واہ واہ ہوئی اور اس کے باپ کو احساس ہوا کہ اس کی بیٹی گوڈر کالال ہے جس کو وہ کیش کروا سکتا ہے۔غزل کے لیے اتنا کافی تھا کہ اس کو نئی فراکیں ملتیں اور وہ چاند کے ساتھ لمبی کار میں بیٹھ کر سوسائٹی کے دفتر جاتی۔جہاں اُس کے دوست غزل کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔اسٹیج والوں کے لیے وہ نہایت اہم تھی کہ کم عمر آرٹسٹ اور اچھے کم عمر آرٹسٹ کمیاب تھے مگر ہمایوں کی حرکتوں کے باعث چاند نے غزل کو اسٹیج سے دور کر دیا مگر کچھ ہی عرصے بعد بھان صاحب خود آ کر اُسے واپس اداکاری کی دنیا میں لے گئے جہاں غزل ایک بار پھر فرش سے عرش پر جا پہنچی۔بھان صاحب کی مہربانیوں کی انتہا نہ تھی جنھوں نے اُس جیسی کم حیثیت لڑکی کو سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل بنایا۔وہ اس کے لیے طرح طرح کے تحائف لاتے۔وہ ان کے گھر وقت گزارتی۔ان کی مہربانیوں پر ان کی شکر گزار اور ان کے اندازِ دلرُبانہ سے گھبراتی بھی مگر وہ خود کو سمجھاتی کہ اس کا گریز ناشکری ہے اور سب سے بڑھ کر وہ یہ سوچتی کہ وہ یہ سب کچھ کسی کو بتا نہیں سکتی۔ایسے میں اس کا احساسِ تنہائی بڑھ جاتا۔

پھر بھی اکثر غزل نے سوچا کہ وہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنی کسی خواہش کا تجزیہ نہ کر سکی۔مگر ایک۔۔۔اسے اس بات پر رونا آیا تھا کہ اپنا دکھ وہ کسے سنائے۔۔۔؟ اس دنیا میں اس کا کون تھا؟۔۔۔سب ہی اس کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔۔۔اس اندھیرے کے جنگل میں خاموشی کے ناپید کنار سمندر میں، میں اکیلی ہوں۔ اس کے دل پر جیسے کوئی بھاری پتھر گر پڑا۔(۸)

اس کے دل میں آہستہ آہستہ اپنی تنہائی کا احساس بڑھتا جہاں اس کا دل محبت سے خالی اور حقیقی جذبات سے عاری تھا۔وہ بس بنیادی ضرورتوں اور آسائشوں پر خوش رہتی لیکن اتنا کچھ پانے کے باوجود بھی اُس کا دل محبت کی گرمی

سے خالی تھا۔وہ بھان صاحب کی چہیتی بن کر ان کے دفتر اور گھر کی زینت تھی اور اسے وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی اسے کبھی تمنا تھی مگر محبت کی بھوک کبھی کم نہ ہوئی۔ایسے میں بلگرامی جو کئی جوان دلوں کی دھڑکن تھا، اس کا ہاتھ تھام کر اُس کی لکیریں پڑھتا ہے اور بھان کی قلعی کھولتا، اس کے عیب بتاتے ہوئے یہ جتاتا ہے کہ وہ محض اس کی خاطر یہاں پڑا ہے تو گویا وہ غزل کو ان تمام جذبوں سے ایک لمحے میں روشناس کروا دیتا ہے جو اُس کے خوابوں میں پرچھائیوں کی طرح اس کا پیچھا کرتے تھے۔

آج غزل کا ہاتھ بلگرامی کے ہاتھ میں تھا اور وہ احمق بالکل نہیں جانتا تھا کہ نفرت کے ریگستان میں بھٹکنے والی پیاسی چڑیا نے محبت کے ایک قطرے کی خاطر اس پر سب کچھ نچھاور کر ڈالا ہے۔(۹)

اور یوں محبت کے نشے میں غزل جوانی کی پہلی سیڑھی پار کر جاتی ہے۔اس محبت میں خود سپردگی کا وہ نشہ ہے کہ اُسے اپنے پامال ہونے کا احساس ہوتا ہے نہ باپ کی لاتوں سے ہی اُسے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔غزل نے بچپن ہی سے اپنی حرکات پر مار کھائی تھی اور بچپن میں بھی وہ زمین پر لوٹیں لگا کر میلی چیکٹ ہونے پر سکون محسوس کرتی تھی کہ یہ بہرحال اُس کا ذاتی عمل ہے، وہ خود پر اختیار رکھتی ہے اس احساس کے باعث وہ ان لاتوں اور گھونسوں کو بھی سہہ جاتی جو ان حرکتوں کی وجہ سے اُسے سہنے پڑتے۔اب بھی یہی ہوا وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ا و رخوش رہتی ہے خواہ اس کا باپ اس سے کتنا بھی ناراض ہو۔وہ اس لیے بھی خوش ہے کہ بلگرامی اس کا دولہا ہے اور اُس نے اپنے دولہا کی قدر کی ، اس کو ناراض نہیں کیا مگر جب بلگرامی نے راہ بدلی تو وہ ٹوٹ گئی اُس نے پہلی بار محبت کی تھی۔اپنا سب کچھ اُس کو سونپا تھا۔خود کو بیاہتا کے روپ میں دیکھتے ہوئے وہ جوانی، بچوں کی منزلوں سے گزر کر بڑھاپے تک کے مراحل کو اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتے دیکھ چکی تھی۔بلگرامی نے راستہ بدلا تو اس کا دل نفرت سے بھر گیا۔ اس میں اور چاند میں یہ فرق ہے کہ چاند کی طرح وہ محبت کا ماتم نہیں کر سکتی۔چھوڑ کے جانے والے کا رستہ دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں کھونے کا اُس کو یارا نہیں بلکہ وہ نفرت سے تھوک کر دوبارہ سر اُٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔وہ اس ناکام محبت کا ماتم کرنے کی بجائے زندگی کی آنے والی خوشیوں بھری امیدوں کو خوش آمدید کہتی ہے۔نصیر کی آمد سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔وہ اسٹیج کی روشنی میں مردوں کا مکر اور رات کی تاریکی میں ان کی ہوس کو برت چکی تھی وہ جان چکی تھی باہر کی دنیا میں عورت مرد کے لیے دل بہلانے کی شے ہے۔وہ محبت کے نام پر دھوکا کھا چکی تھی مگر نصیر کی محبت پر باوجود چاہنے کے وہ خود کو نہ روک سکی۔اُسے یقین تھا کہ وہ بلگرامی کی طرح دھوکا نہیں دے رہا مگر وہ اس محبت میں ڈوبنا نہیں چاہتی تھی وہ خود کو بچانے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی ذات کا خلا ایک بار پھر اس کے احساسِ کمتری کو جگاتا ہے۔

جانے کیوں اپنی تعریف سنتے ہی اس پر ایک سحر سا چھا جاتا تھا۔کہنے والے کی آواز پہلے تو دل میں شہد گھولتی اور پھر ابھی تک تشنہ رہنے والی خواہشوں کا زہر اس کی رگ رگ کو جلانے لگتا۔پچھلی حقارتوں اور نفرتوں کی قطار سی سامنے آ کھڑی ہوتی اور اتنی نفرت، اتنی تاریکی کو دیکھ کر وہ رو پڑتی تھی۔۔۔اب کیا ہو گا۔۔اب وہ مجھ سے کیا کہے گا۔(۱۰)

اور جب نصیر نے اُس سے حالِ دل کہا تو محبت کے جواب میں غزل نے اپنا سارا ماضی اُسے دکھا دیا۔دراصل یہ غزل کا وہ پہلا سچا رشتہ تھا جس میں اُسے جسم کی سودے بازی اور ہوس و مفاد کی پرچھائیاں نظر نہ آئی تھیں۔اس محبت میں غزل نے اپنی محبت نہیں اپنی روح نصیر کے سپرد کی اور یوں غزل نے خود کو ہمیشہ کے لیے اس انگوٹھی سے جو بہوئوں کو منہ دکھائی میں دی جاتی تھی ، اپنا رشتہ جوڑ لیا۔یہ انگوٹھی محض نصیر کی عطا نہ تھی اس کے دل کے تار بھی اس سے جڑ جاتے ہیں۔غزل کو نصیر کی محبت بھی راس نہیں آتی۔نصیر پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر جاتا ہے اور غزل اُس کے ساتھ خود کو وابستہ کیے روز اس کے غم میں گھلتی رہتی ہے۔'رام بن باس' میں گڑھے میں گاڑے جانے کا منظر گویا اس کی تشفی کرتا اور وہ چاہتی کہ سیتا کی طرح ہمیشہ کے لیے زمین میں سما جائے۔جب پہلی بار،روح کی گہرائیوں سے وہ خود کو سونپ دینے کے بعد جدائی اس سے برداشت نہیں ہوتی اور اس کے کرب کے اظہار سے یوں لگتا ہے جیسے اس میں چاند کی روح حلول کر گئی ہے۔

نصیر کے بعد اس کے فسوں انگیز حسن نے سرور کو اپنی گرفت میں لیا۔وہ غریب اور محبت کرنے والا شخص تھا مگر اس کے پاس محبت کے وہی روایتی دلاسے تھے جن سے اب غزل اکتاچکی تھی۔

اس کی یہی سب سے بڑی کمزوری رہی تھی کہ وہ کسی مرد کو مایوس نہیں کر سکی۔اس نے دوسروں کو ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے ہمیشہ اپنی جھولی خالی کی۔مگر وہ محبوبہ بننے کے کھیل سے اکتا چکی تھی۔وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ سرور اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں پناہ دینے کے خواب دکھائے گا۔اسے پیڑ کی ٹھنڈی چھائوں کا لالچ دے گا جو اس کے گھر پر پھیلا ہوا ہے۔(۱۱)

سرور کی وہی عاشقوں والی روایتی ادائیں غزل کو اس سے قریب نہیں ہونے دیتیں۔غزل کسی کی شاعری کی تکمیل اور تخیل کے لیے مواد فراہم کرنے کا ذریعہ نہ بننا چاہتی تھی۔جیلانی بانو غزل کی شکل میں عورت کی اُس فطری خواہش کو سامنے لانا چاہتی ہیں جو شمع محفل کی بجائے شمع خانہ ہونے کو ترجیح دیتی ہیں۔جہاں وہ اپنے دل کے محرم کے سامنے اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ایسے میں ایک گھر اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بڑی رومانوی معلوم ہوتی ہیں۔لہٰذا وہ سرور کے ساتھ زندگی گزارنے پر نصیر کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ایوانِ غزل میں نہ اب واحد حسین تھے نہ بی بی کی شفقت، ایسے میں وہ رنگما کی محبت میں دیوانی ہوئی پھرتی ہے جو سنجیوا کی بیٹی ہے جو چاند کے سپرد کی گئی تھی، چاند کے مرنے کے بعد غزل نے اُسے گھر والوں سے چھپا کر رکھا ہوا تھا یوں اس کی زندگی میں جہاں اتنے طوفان تھے وہاں ایک رنگما بھی تھی جو اس کی زندگی کا واحد سہارا بنی ہوئی تھی۔غزل کم عمری میں زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو برت چکی تھی مگر اس کا دامن خالی تھا۔شکستگی اور پژمردگی کی انتہا یہ ہے کہ شیخو بھائی جیسی ہستی سے جب اُس کے بیاہ کی بات ہوتی ہے تو وہ جو اپنے لیے احتجاج کا کوئی راستہ ضرور نکال لیتی ہے۔خود کو تقدیر کے حوالے کر دیتی ہے۔مگر شاہین گھر بھر کی مخالفت مول لے کر نہ صرف اس شادی کو رکواتا ہے بلکہ دن رات کے ساتھ میں وہ کہیں ان روتی آنکھوں کے فسوں کا شکار بھی ہو

جاتا ہے۔وہ غزل سے شادی کی خواہش کرتا ہے۔غزل نصیر کی محبت میں گم اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے کہ وہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو روح کا سودا ایک بار کرتے ہیں،شادی کی اس پیشکش پر وہ شاہین کو اس ہمدردی کے نتیجے میں پیش آنے والے نتائج سے ڈراتی ہے مگر شاہین ایک شوہر کی طرح اس کی ذمہ داری اٹھانے کا یقین دلا کر اس سے شادی کرتا ہے لیکن غزل چونکہ خود کو روحانی اور جذباتی طور پر خود کو نصیر کے سپرد کر چکی ہے اس لیے وہ نہیں سوچتی کہ زندگی اس ایک مرکز سے آگے بڑھنے جا رہی ہے:

غزل شاید ابھی تک پرانی یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔جاہل اور ناسمجھ لڑکی۔وہ شاید اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ نصیر کی پہلی محبت ہی اس کی حقدار ہے۔اس لیے نصیر کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی میں پڑی تھی اور وہ شاہین کے ساتھ یوں نبھا رہی تھی جیسے اس کی بیوی نہ ہو اس کی خادمہ ہو۔دو پیسے کی چھوکری جسے کسی بھی وقت دھتکارا جا سکتا ہے۔(۱۲)

غرض غزل نے زندگی کا سودا کر کے محبت کا خانہ نصیر کے لیے وقف کر دیا مگر جب وہ خود کو موت کے حوالے کرنے جا رہی تھی نصیر نے اس سے وہ انگوٹھی واپس مانگ لی۔جس میں اُس کی جان تھی اور جس کو موت کے بعد بھی خود سے جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھی تو اُس رات اپنے وجود سے اُسے اتنی گھن آئی کہ اس نے خود آئینے پر تھوک دیا اور اس رات وہ دنیا کے غموں سے نجات پا گئی۔

دراصل غزل کا کردار نوابین کے گھر میں عورت کی حیثیت سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ اس پر غزلیں لکھی جائیں اور جس کے وجود سے ان کے تخیل کا چراغ روشن ہو۔غزل ان عورتوں میں سے ہے جن کے پاس جینے کا اختیار ہے نہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کا۔مردوں کے ہاتھوں برباد ہوتی عورتوں کی ذات، ان کی انا اور ان کا تشخص دراصل اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر خواتین ناول نگاروں کے ہاں مرکزی کردار عورتوں کے ہی ہیں اور ان کرداروں میں محض ایک روایتی عورت ہی نہیں نظر آتی اس عورت کے دل و دماغ کی گرہیں بھی کھلتی ہیں۔عورتیں کیا سوچتی ہیں اور زندگی سے کیا چاہتی ہیں۔ان کا اپنا وجود ہے جو رشتوں کے بندھنوں میں بندھنے کے باوجود نہیں مرتا۔جس میں ان کی اپنی سوچ اور زندگی کے بارے میں نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔عموماً خواتین ناول نگاروں نے عورت کی کہانی ہی بیان کی ہے۔ان کے ناولوں میں قصہ بھی روایتی نہیں بلکہ وہ کہانی کا تانا بانا عورت کے دل سے نہیں بلکہ اس کے ذہن میں ہونے والی کشمکش سے بنتی ہیں۔اس لیے ان کے ناول، موضوعی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ نسوانی کرداروں کی پیشکش کے اعتبار سے بھی منفرد اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳، ص۱۹۹

۲۔ جیلانی بانو، تین لکیریں، مشمولہ: نئی عورت، فکشن ہائوس لاہور، ۱۹۹۳، ص۱۱

۳۔ جیلانی بانو، ایوانِ غزل، فرینڈز پبلشرز، کراچی، س۔ن، ص۱۴۱

۴۔ ایضاً، ص۲۴۶

۵۔ ایضاً، ص۲۹۱

۶۔ ایضاً، ص۱۵۳

۷۔ ایضاً، ص۱۹۵

۸۔ ایضاً، ص۱۵۳

۹۔ ایضاً، ص۲۶۵

۱۰۔ ایضاً، ص۲۷۱

۱۱۔ ایضاً، ص۳۰۳

۱۲۔ ایضاً